محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ؁

اور اگر تمہیں اس قرآن میں شبہ ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمایا تو تم بھی قرآن کے انداز کی ایک سورۃ پیش کرو۔ اور اپنے لگے بندھوں کو بھی جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہیں شریکِ مقابلہ کرلو۔ اگر اس کے انکار میں تم حق بجانب ہو۔

نزولِ قرآن کے وقت کی ادبی فضا

قرآن جس زمانہ میں نازل ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ادب و شعر کا مذاق عام تھا۔ جب ایک ایک عرب الفاظ کے تیور پہچانتا تھا۔ اسلوبِ بیان کے تنوعات کو سمجھتا تھا۔ اور معانی پر سر دھنتا تھا۔ جب عکاظ میں محفلیں جمتیں۔ ذو المجنہ میں شعر و مفاخر کا مبادلہ ہوتا۔ اور فصاحت و بلاغت کے مینا و جام گردش میں آتے۔ آنحضرت کی ولادت باسعادت سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے امرأ القیس نے "قفا نبک" کہکر تشبیب و حزن اور غم کا رمحبوب کے لئے دلوں میں گداز پیدا کیا۔ ہجرت سے ساٹھ ستر برس پہلے کا قصہ ہے۔ کہ طرفہ بن عبید نے "لخولۃ اطلال" کہکر عشاق کے لئے ہلاکت کا سامان مہیا کیا۔ ہجرت سے چودہ ہی برس پہلے زہیر نے ایک محفلِ عشق و محبت کا انعقاد کیا اور امِّ اوفی کی یاد میں آنسو بہائے۔ اور یہ تو عہدِ اسلام ہی کی بات ہے کہ لبید جیسا جلیل القدر شاعر موجود ہے۔ جس نے خیالی معشوقہ کو چھوڑ کر حقیقی محبوب کو پا لیا۔ یعنی اسلام کی نعمت سے بہرہ مند ہوا یہ محفلیں یہ ادب و شعر کے چرچے۔ یہ معلقات و قصائد کی تلاوت۔ یہ خطابت و تقریر کے مظاہرے اور اپنے اپنے حلقہ کے شعراء اور خطباء پر فخر و مباہات سب کچھ جاری تھا۔ کہ قرآن نازل ہوا۔ اس نے ادب و کلام کا ایک اور ہی معیار پیش کیا۔ پرانے پینے والوں تک نے کہا۔ اس مے صافی اور شرابِ حقیقت میں جو لطف و سرمستی ہے وہ ہمارے ہاں کی صبوح و غبوق میں کہاں۔ بڑے بڑے معشوقانِ طناز اور شاہدانِ معنی سنج نے احترام میں گردنیں جھکا دیں اور بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا۔

فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ؁ (یوسف)

جب انہوں نے یوسف پر ایک نظر ڈالی تو اسے اپنے گمان سے کہیں زیادہ جمیل پایا اور بیہوشی

میں چھریوں سے اپنے ہی ہاتھ کاٹ ڈالے اور بے اختیار کہنے لگیں کہ حاشا للہ۔ یہ بشر نہیں
یہ تو کوئی پری یا محترم فرشتہ ہے۔

اور تو اور یہ ولید بن مغیرہ بہت بڑا گھاگ۔ تمام اصنافِ سخن کا شناور اور اشہبِ خطابت کا کامیاب شاہسوار جب قرآن سنتا ہے اور اس کے وجوہ اعجاز پر غور کرتا ہے۔ اور اس کے اسالیب کی رنگا رنگی اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہے۔ تو ہانکے پکارے تمام مخالف دوستوں کی پروا کئے بغیر کہدیتا ہے کہ یارو قرآن شعر و اختلاق نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔

قرآن کا اعجاز

قرآن کا ایسے تاریخی دور میں نازل ہونا جب ذوق و ادب کی یہ ارزانیاں ہوں۔ اور پھر انہیں لوگوں میں اسکا مقبول ہو جانا۔ دل کی گہرائیوں میں اتر جانا۔ اور روزمرہ کی زندگی کا جزو بن جانا۔ کیا اس کے اعجاز کی بہت بڑی دلیل نہیں ہے۔ یعنی لوگ ان معلقات کو بھول جاتے ہیں۔ جن کو کبھی آب زر سے لکھا تھا اور کعبہ کی دیوروں پہ آویزاں کیا تھا۔ تغزل و مفاخرہ کے اشعار سینوں سے نکل جاتے ہیں۔ اور قرآن کی آیتیں اور سورتیں زیادہ گہرائی اور استواری کے ساتھ زبان پہ جاری ہو جاتی ہیں۔ کیا اس سے بڑھکر کوئی نشان اس کی عظمت و بلندئ مقام کا تصور میں آسکتا ہے۔؟

آج چودہ سو برس ہوتے ہیں ایک امی کا پیش کیا ہوا کلام اب بھی ہزاروں سینوں میں محفوظ ہے۔ اور دنیا کے ہر گوشہ میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ سر بفلک محل اور ایک ایک جھونپڑے تک میں اس کے نغموں کی گونج ہے۔ لبے پڑھکر جہاں رازی و ابن تیمیہ نے خرد و حکمت کے انبار لگاتے ہیں وہاں ایک عامی بھی اس کی تلاوت سے محظوظ ہوتا اور اس کی برکتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ قبولیت و محبت کا یہ مقام کسی انسانی کلام کو ملا ہے۔؟

یہی وہ حقیقت ہے جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ کم بختو! تمہارا ذہن اس سچائی کی جانب کیوں ملتفت نہیں ہوتا۔ تم محض ضد اور ہٹ دھرمی سے آنحضرت کی مخالفت کرتے ہو۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ چیز جو تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں کس درجہ لاجواب ہے۔ یہ قرآن آخر الفاظ اور حروف ہی کا تو مجموعہ ہے۔ اور اسی بولی کی ترجمانی کرتا ہے جس کو تم استعمال کرتے ہو۔ پھر کیا بات ہے کہ اس کی ایک ایک بات میں غضب کی پھبن اور قیامت کا جلال ہے۔ الفاظ و حروف کے الٹ پھیر میں کیا اعجاز بھر دیا ہے کہ ایک ایک سورت اور ایک ایک لفظ افسردہ نور معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک ایک ادا دل میں اترتی چلی جا رہی ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ انسان کے بالکل سامنے ایک حقیقت ہوتی ہے اور وہ اس پر غور نہیں کرتا۔ سمندر کے سامنے رہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ پانی کی یہ مقدار عظیم کن کن حقائق کو تہہ کی حامل ہے۔ باغوں میں رہتا ہے اور گل و بلبل کے تلازم کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ جنگل میں بسیرا ہے اور نہیں جان پاتا کہ اس کی ہولناک وسعتوں میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا عجائب چھپا رکھے ہیں۔ غرض انسان کی یہ پرانی عادت ہے۔ کہ دور کی کوڑی لاتا ہے اور

سامنے کی سچائیوں سے روگرداني اختیار کرتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جس وقت قرآن نازل ہوا تھا۔ سب سے پہلے یہ لوگ اس کو اس معیار سے جانچتے جس کا انہیں علم تھا۔ یعنی یہ دیکھتے کہ اس کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اس میں اور انسانی کلام میں کیا فرق ہے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ اس کے مقابلے میں شعر و ادب کے پرانے چراغ گُل ہو رہے ہیں۔ اور لو بیٹھتی جا رہی ہے۔ انہوں نے آنحضرت کی تحقیر کو تو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا اور عجیب عجیب امتحانی سوالات آپ سے پوچھ ڈالے۔ مثلاً یہ کہ روح کیا ہے۔ قیامت کب برپا ہوگی۔ اور مرنے کے بعد جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر برابر ہو جائیں گی تو ہم کیسے زندہ ہو سکیں گے؟ مگر آسان معیار اور وہ کسوٹی جسکو وہ بغیر کسی دشواری کے استعمال کر سکتے تھے۔ اس کو برتنے میں مجرمانہ کوتاہی کی۔ یہاں تک کہ یہ فرض بھی قرآن کو انجام دینا پڑا اور کہنا پڑا کہ آؤ صاحب قرآن اور مبلغ علم سے قطع نظر کر کے ذرا اس شے کی جھلک دیکھو جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ کتنا بڑا نشان اور کتنا بڑا معجزہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ وہ قریش جنہوں نے مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اور تذلیل کی کوئی صورت ایسی نہیں رہنے دی جسے نہ آزمایا ہو۔ انہوں نے قرآن کی اس تحدی کے بعد ادھر بالکل توجہ نہیں کی۔ اور ایک آیت بھی سنجیدگی سے پیش نہیں کی جس پر خود ان کو اطمینان ہو۔ کہ یہ قرآن کا مقابلہ کر سکیگی۔

قرآن حکیم نے مخالفین کے ایک ایک اعتراض کو نقل فرمایا ہے۔ اور اور ایک ایک اعتراض کا کئی کئی جگہوں پر جواب دیا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ قریش مکہ کو کن چیزوں میں شبہ تھا۔ اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ یہودی قرآن کے کن کن مسائل پر اختلاف رکھتے تھے۔ نیز عیسائیوں اور دہریوں تک کے شکوک کی وضاحت فرمائی ہے۔ لیکن ایک جگہ بھی یہ مذکور نہیں کہ قریش مکہ نے قرآن کے اعجاز پر کیا حرف گیری کی اور کہاں اعتراض کی انگلی رکھی۔ اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس پہلو سے سرے سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا؟ کیوں؟ اسلئے نہیں کہ ان کی انگلیاں شل کر دی گئی تھیں۔ ان کی زبانوں کو اظہار مدعا سے روک دیا گیا تھا۔ اور ان کی ہمتوں کو سلب کر لیا گیا تھا۔ جیسا کہ بعض معتزلہ نے سمجھا ہے اور اسے صرفہ سے تعبیر کیا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ انہوں نے فی الواقع اپنے دلوں میں یہ محسوس کیا کہ قرآن کی ادبی بلندیوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ کہ مبادا آنے والی نسلوں کے سامنے ہم مضحکہ بنیں۔

آیات معنوی کی ترتیب معنوی

اس مختصر تمہید کے بعد اب سوال یہ سامنے آئیگا کہ دعوی فصاحت و بلاغت کی حقیقت کیا ہے۔ اور کیا وجوہ اعجاز ہے جو قرآن کو انسانی کلام سے ممیز کرتے ہیں۔؟ لیکن ٹھہریئے ان وجوہ اعجاز کی تفصیل سے بھی پہلے بڑے مزے کا یہ نکتہ دیکھتے جایئے کہ قرآن نے اپنے اس دعوی کو جس ڈھنگ سے پیش کیا ہے خود اس میں لطائف و نکات و معارف و حکم کا ایک گنجینہ پنہاں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آیات تحدی مندرجہ ذیل پر ایک نظر ڈالتے جایئے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ

وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (اسراء)

کہہ دیجئے کہ اگر جن وانس تمام ملک اس کے درپے ہوں۔ کہ ایسا قرآن منصۂ شہود لے آئیں تو وہ اس پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ اگرچہ ان میں کا بعض بعض کی مدد پر آمادہ ہو جاتے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ (ہود)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔ کہیئے اگر ایسا ہی ہے تو تم بھی اس انداز کی دس ہی سورتیں بنالو۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (یونس)

کیا ان کا یہ شبہ ہے کہ اس نے افتراء سے کام لیا ہے کہہ دیجئے اچھا تم بھی ایک سورت ایسی تصنیف کر لاؤ۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحدی پورے قرآن سے متعلق ہے۔ دوسری آیت یہ بتاتی ہے کہ دس سورتیں بنا لانا کافی ہے۔ اور تیسری آیت میں ایک ہی سورۃ پہ اکتفا کیا گیا ہے۔

اب اگر یہ آیات کی ترتیب جو مذکور ہے ترتیب نزول کے مطابق ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پہلے پورے قرآن سے متعلق تحدی کی گئی۔ پھر جب ہمتوں میں ضعف و واماندگی دیکھی تو فرمایا۔ اچھا دس ہی سورتیں لکھ ڈالو۔ پھر جب اور رعایت کرنا چاہی تو ایک ہی سورۃ کو کافی گردانا مقصد بہر آئینہ یہ تھا کہ اگر پورا قرآن معجزہ ہے تو ہر ہر سورۃ بھی بجائے خود اعجاز کی حامل ہو گی کیونکہ قرآن نہیں چھوٹی بڑی الگ سورتوں سے مرکب ہے اور اگر ترتیب نزول ان معنوں کا ساتھ نہ دے تو پھر یہ مطلب ہوگا کہ جب قرآن کو پیش فرمایا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی قرآن میں جو جو خوبیاں ہیں وہ سب اس کے جواب میں ہونا چاہئیں یعنی جو کتاب مقابلہ میں پیش کرو۔ اسمیں اسی طرح انسانی ہدایت کا سامان ہو۔ اسی طرح دلائل ہوں۔ اسی طرح مضامین کی فراوانی اور معانی کا ہجوم ہو اسی طرح اقوام و ملل کے اسباب عروج و تنزل کا کھوج لگایا گیا ہو۔ اور اسی طرح زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو واضح کیا گیا ہو اور جب دس سورتیں جواب میں لانے کو کہی گئیں تو اس میں قرآن کی اس خوبی کی طرف توجہ دلائی گئی کہ اسمیں کئی کئی سورتیں اس ترتیب سے آتی ہیں کہ ان میں مضامین کا تسلسل اور تکرار رہے۔ مگر اس کے باوجود کہیں نہیں ہوا کہ چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا گیا ہو بلکہ ہر سورۃ میں ایک طرح کا ارتقا ہے۔ یعنی جو مضمون ایک جگہ مجمل رکھا گیا ہے اسکو دوسری جگہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ یا ایک جگہ بعض گوشوں کی وضاحت نہیں ہوئی تو دوسری جگہ ان گوشوں پر خصوصیت سے روشنی ڈالی ہے۔ ان معنوں میں پورے قرآن میں کوئی آیت مکرر نہیں۔ یعنی ہر جگہ اسمیں نئی آب اور نئی چمک دمک پیدا ہو گئی ہے۔ نئے نکات اور نئی نئی صورتیں غور و فکر کے سامنے آگئی ہیں۔ مغرض یہ ہے کہ تم بھی مضامین کو اس ارتقا کے ساتھ بیان کر کے دکھاؤ کہ لفظاً ہر گو تکرار ہو۔ لیکن بباطن غضب کی جدت ان میں پنہاں ہو۔ اور جب ایک ہی سورۃ کے لئے چیلنج کیا گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک سورۃ بمنزلہ ایک مستقل بالذات فصیح و بلیغ ٹکڑے کے ہے۔ اس کے الفاظ اس کی ترتیب، اسکی فصاحت و بلاغت اور مضامین کی بلندی کی طرف اشارہ ہوگا۔ کہ اگر کئی سورتوں کا تصنیف کرنا اور ان میں ارتقاء معنی کا ملحوظ رکھنا تمہارے لئے آسان نہ ہو تو پھر قرآن کی کسی ایک سورۃ کی محاسن کو سامنے رکھ کر اسی انداز کے محاسن اپنے کلام میں سمو کر دکھاؤ۔